OPEN ACCESS
Al-Qamar
ISSN (Online): 2664-4398
ISSN (Print): 2664-438X
www.alqamarjournal.com

جدید اردو افسانے میں مثالیت پسندی
Idealism in Modern Urdu Fiction

Abdul Sattar
Doctoral Candidate, Adbiat-e-Urdu, University Science & Information Technology D.I Khan
Dr. Iftikhar Baig
Professor, University Science & Information Technology D.I Khan
Dr. Zahid Hussain Dashti
Lecturer Balochi Department, University of Baluchistan, Quetta

Abstract
In Idealism the representation of things in ideal or Idealized form. This concepts that "what is" insufficient and uncomplete and give importance to "what should be" this is the central point of literary idealism. It depends on only the activity of mind. It known as idealism holds that the foundation of reality is thoughts or ideas. Idealism is a philosophy that contends that only awareness or the contents of consciousness can be know, not anything's in the outside world. Urdu short story holds special importance the concept of idealism. Short story has been passing through many changes time to time. Now a days modern short story is showing the dream of an ideal society in which there is no social injustice and economic exploitation.

Key words: Idealism, Foundations of Reality, Philosophy, Social Injustice, Consciousness, Exploitation

تمہید
اردو فکشن کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اس سفر کا آغاز داستان سے ہوتا ہوا ناول تک اور ناول سے افسانہ، مختصر افسانہ اور سو لفظوں کی کہانی تک آپہنچا ہے۔ ان سب نثری اصناف میں سب سے توانا اور روشن روایت افسانے کی دکھائی دیتی ہے۔ اردو ادب میں مختصر افسانے کی عمر ابھی زیادہ نہیں لیکن اس کے باوجود اس نثری صنف نے بڑی ترقی کی ہے۔ 1960ء کے بعد اردو افسانہ عروج پر دکھائی دیتا ہے اس میں کئی ایک رجحانات اور تغیرات پیدا ہوئے۔ اس صنف ادب سے تنقید حیات کا کام بھی لیا گیا اور

CC BY

اس میں انسانی خواہشات، تصورات اور خوابوں کی کہانیاں بھی رقم ہوئیں۔ اگر ہم اپنی ادبی تاریخ پر نظر ڈالیں تو اصناف کی شکست وریخت کا عجب تماشا دکھائی دیتا ہے۔ اپنے دور میں پر شکوہ اصناف آنے والے ادوار میں، وقت کے سامنے اپنی بے دست وپائی کے باعث کس طرح فنا کے گھاٹ اترتی رہیں اور دوسری طرف نئی اصناف کس طرح بالیدہ ہو کر مائل بہ عروج ہوتی رہیں۔ یہ ایک دلچسپ امر ہے۔ اردو زبان وادب کی ادبی تاریک میں مختلف اصناف دم توڑتی رہیں تو دوسری طرف جنم بھی لیتی رہیں۔ داستان سے افسانے تک کا سفر اس کی بہترین مثال ہے۔ بعض اصناف ادب اپنی پیدائش کے کچھ ہی عرصہ بعد شیر خوارگی کے عالم میں فنا کی منزل سے گزر گئی اور بعض نے ایسی بھرپور زندگی پائی اور پھلی پھولیں کہ ایک زمانہ ان کا معترف ہوا۔ اردو افسانہ اس کی بے نظیر مثال ہے۔ اردو افسانے نے زندگی، وقت اور حالات کے تقاضوں کو خوب نبھایا اور حیاتِ جاوید حاصل کر لی۔

جدید عہد کا رزمیہ

ناول کو جدید عہد کا رزمیہ کہہ کر اس کا رشتہ حیات انسانی کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔ آج ادب کی وہی صنف زندہ ہے جو ضرورت کو نبھا رہی ہے۔ افسانہ کی بحیثیت صنف ادب اہمیت کا اندازہ ہم اس بنیاد پر لگا سکتے ہیں کہ دیگر اصناف کے دورِ جدید میں مختصر کہانی جس انداز سے افسانہ انسان کی جس جمالیاتی خط کا اہتمام اور بیک وقت جس طرح انسان کے تصوراتی اور عقلی پہلوؤں کو شدت سے متاثر کرتا ہے۔ شاعری اور ناول دونوں اس اعجاز سے محروم ہیں۔ افسانہ ناول کی تصغیری صورت ہے یا اس کی ارتقائی شکل ہے۔ اختصار کے علاوہ ناول اور افسانے میں فنی سطح پر کوئی خاص فرق بھی نہیں ہے۔ لیکن جلد ہی افسانے نے اپنے خدوخال وضع کر لیے اور ناول کے بہت قریب ہونے کے باوجود بہت دور ہو گیا۔ اس نے زندگی کے ہر پہلو اور خواب سے اپنا تعلق استوار کر لیا۔ لہٰذا اختصار میں بھی معنویت کا جہاں سمو دینا اور کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ دینا افسانے کے فن کی بنیادی خصوصیات اس کی پہچان بنی۔

افسانہ کے فن کا آغاز

افسانہ (مختصر کہانی) کے فن کا آغاز بیسویں صدی کے عشرہ اول میں ہوا۔ اس لیے اس کے آغاز کا سرا صنعتی انقلاب کے ساتھ جڑا ہوا ہے، جس نے انسانی صورت حال کو تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ خیال کہ صنعتی انقلاب کی وجہ سے زندگی میں تیزی آئی اور وقت کی کمی کا جو احساس پیدا ہوا اس نے مختصر افسانہ کے فن کے فروغ میں کلیدی کردار ادا کیا۔ بولیم بوائڈر قم طراز ہیں:

> "مغرب کی نشاۃ ثانیہ کے ماحصل میں جو صنعتی انقلاب و ارداور ارتقاء پذیر ہوا اس کے نتیجے میں اور بالخصوص نچلے متوسط طبقے میں شرح خواندگی بڑھی، ساتھ ہی ان کی اساسی حیوانی و نفسانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے بعد خوش وقت (روحانی بالیدگی) کے لیے دن کے چوبیس گھنٹوں میں جو وقت بچا اس میں ناول جیسے طویل بیانیہ کے لیے نہ تو دل جمعی میسر آسکتی تھی اور نہ وقت۔"[1]

یہ حقیقت ہے کہ اس صنعتی انقلاب نے انسان کو عدیم الفرصت بنا دیا تھا۔ جمالیاتی اور فنی ذوق کی تسکین کے لیے اسے کسی مختصر صنفِ ادب کی ضرورت تھی۔ اس صورت حال میں افسانے نے اس کمی کو پورا کیا۔ اگر کہانی کے آغاز سے دور جدید تک اس کے ارتقائی سفر پر نظر ڈالی جائے تو یہ بتدریج اختصار کی طرف گامزن رہی ہے اور اس کے پیچھے انسان کی تہذیبی، تمدنی، صنعتی مصروفیات ہیں۔ جیسے جیسے انسان دشت ودریا کی وسعتوں اور فطرت سے آزاد ہو کر تہذیب وتمدن کے حصار میں سمٹتا گیا۔ ویسے ہی کہانی کا کینوس اور حجم بھی چھوٹا ہوتا گیا۔ اختصار افسانے کا مجموعی تخلیقی رویہ قرار پایا اور انسان کی بدلتی ہوئی زندگی کے

تقاضوں کی عکاسی کرنے لگا۔ مختصر افسانے نے اس زندگی کو نوع بہ نوع تجربات اور انسانی زندگی کے جذبات و احساسات اور تصورات میں سے ان کا انتخاب کیا جن کا شاعری یا ناول اظہار کرنے سے قاصر تھے۔ افسانے نے اپنی نئی شعریات اور اصول وضع کیے اردو افسانے میں روایت کے تسلسل اور کچھ عناصر کا اثر اپنی جگہ مگر حقیقت یہ ہے کہ افسانہ فنی حیثیت سے ایک بالکل نئی صنف ہے اور جدید زندگی کا جدید اظہار یہ ہے۔ اس لیے ناقدین ادب اس نقطہ پر متفق ہیں کہ اختصار اور وحدت تاثر افسانے کے بنیادی عناصر ہیں جن کے بغیر افسانے کی شناخت بہت مشکل ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ معاشرتی، معاشی، سیاسی تغیرات نے افسانے کو ہمیشہ متاثر کیا۔ 1947ء میں برصغیر کی تقسیم کے نتیجے میں لا جواب اردو افسانہ تحریر میں آیا۔ معاشرے اور سیاست کی خامیوں کے ساتھ فسادات کے موضوع نے اردو افسانے کو اپنی گرفت میں لیے رکھا۔ ادب کا سیاسی استحکام اور انتشار سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ جن ممالک میں امن و امان اور خوشحالی کا دور دورہ ہو وہاں ادب نسبتاً کم تخلیق ہوتا ہے۔ اس کے برعکس انتشار اور افراتفری کی کوکھ سے اعلیٰ اور معیاری ادب جنم لیتا ہے۔ اردو افسانے میں کوئی نہ کوئی نیا اسلوب بھی آتا رہا، مگر کوئی اسلوب افسانے سے مکمل طور پر یکایک غائب نہیں ہو جاتا۔ اردو افسانے نے بیانیہ سے علامت اور علامت سے تجریدی افسانے تک کا جو سفر طے کیا اس میں بھی کچھ نہ کچھ روایت کا اثر موجود ہے۔ ناقدین ادب کا خیال ہے کہ جدید اردو افسانے کا آغاز 1960ء کے قریب ہوا۔ بعض ناقدین اس کا آغاز "انگارے" کی اشاعت سے جوڑتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ 1958ء کے مارشل لا کے بعد تخلیق کاروں نے اپنے انداز میں سوچا۔ میرے خیال میں بیانیہ کی جگہ علامت اور تجرید کا استعمال اسی دور کے خوف کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب ادیب اپنے جذبات و تصورات کا اظہار براہ راست نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے اس نے علامت اور تجرید کا سہارا لینے میں ہی عافیت سمجھی۔ لہٰذا اس عہد میں علامت اور تجریدی افسانے نے عروج پایا۔ اس علامتی اور تجریدی افسانے میں انسانی خوابوں اور خواہشات کو بھی موضوع بنایا گیا اور حقیقت کو علامت کے پردے میں پیش کیا گیا۔

نیا اسلوب و بیان

اردو افسانے نے آغاز سے عہد حاضر تک نت نئے تجربات کو اپنے دامن میں سمویا اور اپنی منزل کی طرف گامزن رہا۔ انھیں تجربات کے سبب مختلف ادوار میں اردو افسانوں کو مختلف نام دیئے گئے۔ اردو افسانہ ہمیشہ سے ہی تجربات کا مرکز بنا رہا۔ بہت کم مدت میں اردو افسانے میں اتنی جدت اس کے دامن کے وسعت کی دلیل ہے۔ موضوع، تکنیک، اسلوب، کردار نگاری، زبان و بیان کا نیا پن، جدت نے اردو افسانے کو بہت متاثر کیا ہے کہ آج اردو کا افسانوی ادب فکشن کے میدان میں منفرد پہچان رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے اردو افسانہ کبھی علامتی افسانہ، تجریدی افسانہ، نفسیاتی افسانہ، بیانیہ افسانہ یا جدید افسانہ کے مختلف ناموں سے موسوم ہوتا رہا۔ جدید اردو افسانہ بارے پروفیسر خورشید اپنی اہم تصنیف "جدید اردو افسانہ" میں رقم طراز ہیں!

> "افسانہ کوئی جامد یا سنگ بستہ صنف نہیں ہے، اس میں تجربہ، تبدیلی اور اضافہ کو قبول کرنے کی بھرپور صلاحیت ہوتی ہے۔"[2]

جدید اردو افسانہ کے حوالے سے 1960ء کی دہائی میں اردو افسانہ فکری اور فنی بلندیوں کو چھو رہا تھا۔ اردو افسانہ نگاروں کی ایک بڑی جماعت مقداری اور معیاری حوالے سے اعلیٰ پائے کے افسانے تخلیق کر رہی تھی۔ اس دور میں معاشرتی حقیقت نگاری اور نفسیاتی مثالیت کے حامل عمدہ افسانے ملتے ہیں۔ یہ وہ دور تھا جب سعادت حسن منٹو، انتظار حسین، راجندر سنگھ بیدی، غلام عباس،

عزیز احمد، کرشن چندر اور عصمت چغتائی وغیرہ اپنے تخلیقی عروج پر تھے۔ اسی دور میں علامتی اور تجریدی افسانے کو اہمیت حاصل رہی۔ سعادت حسن منٹو کا افسانہ "پھندنے" جسے اردو میں علامتی اور تجریدی افسانے کا اولین نقوش قرار دیا جا سکتا ہے۔ کرشن چندر کا افسانہ "غالیچہ" بھی نئے امکانات کو پیش کرنے کی ایک عمدہ کوشش ہے۔ عزیز احمد، انور سجاد، اشفاق احمد، بانو قدسیہ اور خالدہ حسین نے بھی عام روش سے ہٹ کر علامت اور تجرید کو اپنے فن میں مہارت سے استعمال کیا۔

جدید اردو افسانے میں کہانی پن کا مسئلہ

جدید اردو افسانے میں کہانی پن کا مسئلہ بھی پیدا ہوا۔ اگر کہانی کے مختلف واقعات میں ایک منطقی ربط ہو گا تو ایسا افسانہ منظم پلاٹ کا حامل قرار دیا جاتا ہے لیکن جدید افسانہ عموماً پلاٹ سے آزاد اور بعض اوقات تو خود کلامی کی تکنیک میں تحریر کیا جاتا ہے۔ اس جدید افسانے نے کہانی پن جس کو افسانے کا جزو لاینفک قرار دیا جاتا تھا نظر انداز کر دیا اور اینٹی سٹوری کا آغاز کیا۔ کردار غائب ہو گئے، واقعات کے سلسلے کی جگہ خیالات نے لے لی۔ مکالمے کو خود کلامی میں بدل دیا گیا اور محسوسات پر مبنی کہانی لکھی جانے لگی۔ زمانی تسلسل، باقاعدہ آغاز، وسط اور اختتام کو بھی مد نظر رکھا گیا۔ روایتی افسانے کی سبھی شرائط اٹھا دی گئیں اور افسانے کی شرط لازم وحدت تاثر بھی ختم ہو گئی۔ فرمان فتح پوری جدید افسانے کے اس رجحان بارے رقم طراز ہیں:

> "1960ء سے پہلے عموماً افسانہ اسے کہتے تھے جس میں ایک منظم پلاٹ، کوئی کردار کہانی، کہانی کے روپ میں کوئی خاص واقعہ اور وحدت زمان و مکان کے ساتھ ایک مخصوص تاثر ضرور پایا جاتا ہو۔ یہ شرائط بھی بر قرار رہیں لیکن ان شرائط سے انحراف کر کے، افسانے کو بالکل نئے پیرائے میں مرتب کیا گیا۔ لیکن یوں کہنا چاہیے کہ جدید تر افسانہ پرانی روایتوں اور فنی تکنیک کی پابندیوں سے آزاد ہو گیا۔ اب کسی واضح پلاٹ، کردار یا تاثر کی ضرورت نہ رہی بلکہ اسے عہد حاضر پر پیچ، مبہم اور حیران کن زندگی کا ایک مبہم اور حیران کن استعارہ بنا دیا گیا۔"[3]

بیروں بینی کی اہمیت

قدیم افسانے میں بیروں بینی کو اہمیت حاصل تھی مگر جدید افسانے نے دروں بینی کو پروان چڑھنے میں مدد کی۔ اس افسانے نے تخیل اور تصورات کو حقیقت پسندی کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دی۔ مثالیت پسندی بھی تصورات، خیالات اور خوابوں کی دنیا کی بات کرتی ہے۔ انسانی بے بسی، بے چارگی، جو موجود ہے اس کو ناکافی سمجھنا اور کسی اور ہی دنیا کی تلاش میں رہنا ادبی مثالیت کی خاص پہچان ہیں۔ مثالیت پسندی اور رومانوی انداز نظر میں کافی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں کا جہاں تصوراتی دنیا اور تخیل پرستی ہے۔ اسی طرح جدید افسانے کا مشاہدہ کیا جائے تو خارجی واقعیت نگاری کی بجائے باطنی تصورات پر انحصار کیا جاتا ہے۔ خواب اور شکست خواب اس افسانے کا غالب موضوع دکھائی دیتا ہے۔ زندگی اور انسان کی مثالی تصویر کشی ادبی مثالیت کا

بنیادی نکتہ قرار دی

جاتی ہے۔ حیات انسانی اور معاشرے میں اعلیٰ اقدار کی خواہش، تخیل آفرینی، بے نظیر اور مثالی معاشرے کا خواب، مثالیت پسندی کے خاص موضوعات رہے ہیں۔ مثالیت پسند انسان حال سے غیر مطمئن رہتے ہیں اور اسے اپنے تصورات کے مطابق تبدیل کرنے کے آرزو مند ہوتے ہیں۔ وہ زندگی کی مثالی تصویر کشی تخیلاتی سطح پر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ایسے مثالی معاشرے کے خواب دیکھتے ہیں جہاں سماجی ناانصافی اور معاشی استحصال کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ مثالیت پسند افسانہ نگار بھی ایک

مثالی تصور کی آرزومندی کو اپنے افسانوں میں مرکزی اہمیت دیتے ہیں۔ اس افسانے میں حقیقت کو سادہ بیانیہ انداز میں بیان کرنے کے برعکس علامت، استعارہ، داستانوی تخیل پرستی اور مثالیت وغیرہ کے استعمال سے نیا اسلوب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ تخیل اور تصور کے زور پر ان جانی اور ان دیکھی دنیاؤں کی سیر کروائی جاتی ہے۔ اس طرح جدید افسانہ نگاروں نے مثالیت کو اپنے افسانوں میں بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے۔

جدید اردو افسانہ نگار افسانوں میں مثالیت پسندی

جدید اردو افسانہ نگار جن کے افسانوں میں مثالیت پسندی کے رجحانات کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے غلام عباس، انتظار حسین، انور سجاد، اشفاق احمد، نیر مسعود، رشید امجد، اسد محمد خان، احمد ندیم قاسمی، مظہر الاسلام، مرزا حامد بیگ اور خواتین افسانہ نگاروں میں عصمت چغتائی، بانو قدسیہ، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، خالدہ حسین، جیلانی بانو کے نام خاصے اہمیت کے حامل ہیں۔ مثالیت پسندی، تصورات کا جہاں ہے جو اس مادی دنیا سے بالکل برعکس ہے۔ یہ نظریہ ہر چیز کو کامل اور آئیڈیل صورت میں دیکھنے کا متمنی ہے۔ مثالیت پسند انسان کا خیال ہے کہ یہ مادی دنیا وہم و خیال اور سراسر دھوکہ ہے جس نے انسان کو ذہنی تسکین فراہم نہیں کی اور اگر انسانی ذہنی و قلبی تسکین کا متلاشی ہے تو وہ خیالات، تصورات کی دنیا میں چلا جائے۔ اس مادی دنیا کو بھی، صرف تصورات کو مثالی صورت میں دیکھنے اور بنانے کی آرزو کرتا ہے۔ اس حوالے سے ہر انسان کسی نہ کسی حد تک مثالیت پسند ہوتا ہے کیونکہ ہر انسان کے خواب، مخصوص تصورات ہیں جن کو حقیقت میں ڈھالنے کے لیے وہ سعی مسلسل کرتا رہتا ہے۔ مثالیت کے لیے، عینیت، تصوریت کی اصطلاحات مستعمل ہیں۔ اردو افسانہ نگاروں نے بھی اپنے افسانوی ادب میں زندگی کو اس طرح پیش کرنے کی بجائے جیسی کہ وہ ہے، اس طرح پیش کیا ہے جیسی ایسے ہونا چاہیے۔ اس حوالے سے مثالیت پسندی، حقیقت پسندی کا متضاد رویہ ہے۔ مثالیت پسندی میں ہر رویہ، قول، عمل مثالی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ مثالیت پسندی کے یہ بنیادی زاویے افلاطون کے افکار سے اخذ شدہ ہیں۔ افلاطون کو ہی مثالیت پسندی کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ اردو کے افسانوی ادب کے تنقیدی جائزے سے آشکار ہوتا ہے کہ راشد الخیری، پریم چند، یلدرم، نیاز فتح پوری سے لے کر دور حاضر تک کے افسانوں میں مثالیت پسند سوچ کی عکاسی کسی نہ کسی صورت میں ہوتی آئی ہے۔ ہر انسان کے کچھ خواب اور مخصوص تصورات اس کے تخلیقی ادب کا موضوع بنتے ہیں جو اس کی مثالیت پسند سوچ کا اظہار ہی ہوتے ہیں۔

غلام عباس جدید اردو افسانے کے آغاز سے پہلے ہی فنی پختگی کی منازل طے کر چکے تھے۔ اس کے باوجود جدید اردو افسانے میں انھیں عام آدمی کا افسانہ نگار کے طور پر جانا جاتا ہے۔ ان کے افسانوں میں عام آدمی کے تصورات، ان کے خوابوں کی کہانیاں انھیں منفرد پہچان عطا کرتی ہیں۔ غلام عباس کی مثالیت پسند سوچ کی بہترین عکاسی افسانہ "کتبہ" اوور کوٹ اور "کن رس" میں دیکھی جاسکتی ہے۔ افسانہ "کتبہ" میں ایک کلرک کی خواہشات اور تصورات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ افسانہ مثالیت پسندی کی عمدہ مثال قرار دیا جاسکتا ہے۔ جس میں انسان کی تمناؤں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ہر انسان اپنے تصورات میں روشن مستقبل کی امید لگائے اچھے دنوں کے خواب دیکھتا ہے۔ یہ افسانہ شریف حسین کے خوابوں کی ہی کہانی قرار دیا جاسکتا ہے۔ افسانے کی یہ سطریں سنیں اس عویٰ کی بہترین دلیل ہیں:

> "مستقبل کی یہ خیالی تصویر اس کے ذہن پر کچھ اس طرح چھاگئی کہ یا تو وہ اس مرمریں ٹکڑے کو بالکل بے مصرف سمجھتا تھا یا اب اسے ایسا محسوس ہونے لگا گویا وہ ایک عرصے اس قسم کے ٹکڑے کی تلاش

میں تھا اور اگر اسے نہ خرید تا تو بڑی بھول ہوتی۔"[4]

قراۃالعین حیدر کے افسانے

قراۃالعین حیدر کو جدید اردو افسانے کا نقطہ آغاز قرار دیا جاتا ہے۔ اردو کا افسانوی ادب آج بھی ان کے سحر میں گرفتار ہے۔ ان کے پہلے افسانوی مجموعہ "ستاروں سے آگے" کو جدید افسانے میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس مجموعہ کے افسانوں میں پہلی بار اس ریاضیاتی منطق کو توڑا گیا ہے جو واقعات اور کرداروں کو خطِ مستقیم میں سفر کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ ان افسانوں میں ہمارے خوابوں اور خواہشات کو ہی موضوع بنایا گیا ہے۔ مسرت کی تلاش ہو یا تصوراتی دنیا کی تکمیل کی خواہش، کسی اور ہی دنیا میں زندگی بسر کرنے کی آرزو قراۃالعین حیدر کو ایک مثالیت پسند افسانہ نگار کے طور پر ہمارے سامنے لاتی ہیں۔ ان کے اکثر افسانوں میں اکیسویں صدی میں اخلاقی اقدار کی تنزلی اور زوال آدم اور گمشدہ تشخص کو تلاش کرنے کی جستجو ملتی ہے۔ وہ ان مثالی اقدار و روایات کی بازیابی کے خواب دیکھتی ہیں جو سماج کا حسن تھیں۔ ان کے افسانوی ادب میں تشخص کی تلاش کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ امجد طفیل رقم طراز ہیں:

> " قراۃالعین حیدر کی تحریروں کا مرکزی موضوع تشخص کی تلاش ہے۔ ان کے ہاں بطور فرد اپنے تشخص کی تلاش کے ساتھ ساتھ اجتماعی تشخص کا مسئلہ بھی موجود ہے وہ تاریخ اور وقت کے دھارے میں فرد کے مقام کی تلاش کرتی ہیں۔"[5]

یہ تلاش دراصل ایک نئی دنیا کی تلاش ہے جو اس دنیا سے بالکل منفرد اور مثالی ہے جو آج ہمارے خارج میں موجود ہے۔ یہی تلاش، آرزو انھیں مثالیت کے قریب لے جاتی ہے۔ ادیب ہمیشہ اپنی تہذیبی اقدار و روایات سے رشتہ استوار کرتے رہیں گے۔ ترقی پسند افسانہ بنیادی طور پر حقیقت کو اہمیت دیتا رہا لیکن اس کے باوجود ترقی پسندیت میں بھی مثالیت کے رجحان مار کسزم کے نظریہ کے مطابق ایک مثالی معاشرہ اس وقت معرض وجود میں آئے گا جب طبقاتی تقسیم مٹ جائے گی اور اس کے بعد ایک غیر طبقاتی معاشرہ تشکیل پائے گا۔ کارل مارکس اس مثالی معاشرے کو اشتراکی سماج سے موسوم کرتا ہے۔ اس مثالی معاشرہ میں مارکس کے نجی مالکیت کے تصور کو رد کیا اور محنت کے مطابق معاوضہ اور مساوی انسانی حقوق کی بات کی۔ مارکس نے ان نظریات نے اردو افسانے کو براہ راست متاثر کیا۔ اردو افسانے میں نفسیاتی رجحان کے عقب میں فرائیڈ کے نظریات کو اساسی مقام حاصل ہے۔ فرائیڈ کے نظریات نے بھی ایک نئی طرح کی حقیقت نگاری اور مثالیت کو اردو افسانے میں متعارف کروایا ۔ ترقی پسند مثالیت میں ایسے مثالی سماج کے خواب دیکھے گئے جہاں طبقاتی تفریق نہ ہو، مزدور اور نچلے طبقے کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں جو جاگیر دار اور سرمایہ دار کو حاصل ہیں۔ جدید اردو افسانے میں اس طرح کی مثالیت کی بہترین مثالیں احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں موجود ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے قاری کو ایک مثالی دنیا کی سیر کروائی ہے۔ وہ پنجاب کی تہذیب اور اس کی مثالی اقدار و روایات کے بھی قصیدہ خواں ہیں۔ وہ ان مثالی اقدار کو مستقبل کے معاشرے میں بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان اقدار و روایات کی ترقی و ترویج ان کا خواب ہے۔ اس طرح کی مثالیت ان کے افسانہ "بے گناہ"، "بڈھا کھوسٹ"، "چور" اور ممتا میں دیکھی جا سکتی ہے۔ "کپاس کا پھول"، قاسمی کا ہی نہیں اردو کا لاجواب افسانہ ہے جو اپنے دامن میں مثالیت کو سموئے ہوئے ہے۔ اس افسانے کا مثالی کردار "تاجو مائی" کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ یہ ایک درد دل رکھنے والا، انسانیت سے محبت کرنے والا بے مثل کردار ہے۔ جو اپنی زندگی بھر کی کمائی اپنا کفن بھی ایک برہنہ جسم کو ڈھانپنے کے لیے پیش کر دیتا

ہے۔ افسانہ "بڈھاکھوسٹ" بھی قاسمی کی مثالیت پسند فکر کا بہترین عکاسی ہے۔ اس افسانے میں مثالی کردار "بابا عمر" اس کائنات میں خالق حقیقی کا ایک تحفہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایسے کرداروں سے آج بھی ہماری دنیا خالی نہیں ہے۔ یہ انسان دوست کردار گلیوں سے پتھر اٹھاتا پھرتا ہے، مسافروں کے کھانے کا انتظام کرتا ہے، کبھی کسی کے جنازے کو کندھا دے رہا ہے۔ معاشرتی فلاح کے سبھی کاموں میں شامل ہے۔ کسی بھی عہد کی مثالی اقدار و روایات کو اس زمانے کے ادب نے اپنے دامن میں جگہ دے کر نسلِ نو تک منتقلی کا فرض احسن انداز میں ادا کیا ہے۔ یہی مثالی اقدار و روایات آج بھی ہمارے ادب کا غالب حصہ ہیں۔ عصر جدید کے افسانے بھی دور حاضر کی تہذیب اور اس کی اقدار و روایات کے آئینہ دار ہیں، اس بے مثل، مثالی کردار بارے قاسمی صاحب رقم طراز ہیں:

> "بابا عمرو نے محنت مزدوری کر کے جوانی گزاری۔ ادھیڑ عمر میں شادی کی چار مہینوں کے بعد بیوی دق میں مبتلا ہو گئی اور جب مری تو بابا عمرو کو خدا کا شکر ادا کرتے سنا گیا۔ کہتے ہیں، بیوی کو دفنا کر جب وہ گاؤں میں آیا تو سیدھا مسجد میں جا گھسا۔ شکرانے کے نفل ادا کیے اور ہاتھ اٹھا کر بلند آواز میں دعا دی۔ "میرے اللہ تو بڑا بے پرواہے اس لیے شکایت فضول ہے۔ تو جو کرتا ہے، اچھا کرتا ہے۔ تیری مرضی یہی تھی تو میں کون ہوتا ہوں ناک بھوں چڑھانے والا۔ شکر ہے تیرا۔ شکر ہے!"[6]

انتظار حسین کے افسانے

جدید اردو افسانے کا ایک بڑا نام انتظار حسین کے افسانوں کا موضوع ماضی کی یاد اور اس کی باز خوانی کی خواہش ہے۔ ہجرت کا موضوع، مثالی اقدار و روایات، تہذیب و تمدن اور گزرے ہوئے دور کی یادیں ان کے فن میں ناسٹلجیا پیدا کرتی ہیں۔ وہ دور حاضر کے دکھ کو بھی عہد گزشتہ سے پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور ماضی کی مثالی تہذیب و معاشرت کی قصیدے پڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے انسان کی ازلی محرومیوں کی کہانیاں بھی لکھیں اور انسان، کائنات کو مثالی صورت میں دیکھنے کی خواہش کا اظہار بھی کیا ہے۔ انھیں شدت سے اس کا احساس ہے کہ ان کی ذات کا کوئی حصہ کٹ کر ماضی میں رہ گیا ہے۔ اور موجودہ معاشرے کی کوئی تصویر اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کٹے ہوئے حصے کو تخیل کے راستے واپس لا کر اپنی ذات میں نہ سمویا جائے۔ ان کے اولین افسانوی مجموعے "گلی کوچے" کے افسانوں کے اکثر کردار حزن و ملال میں مبتلا کسی اور ہی دنیا کے متلاشی نظر آتے ہیں۔ وہ دنیا کے خوابوں کا عکسِ جمیل ہے۔ ایک مثالیت پسند انسان کے مخصوص خواب، تصورات ہوتے ہیں جن کی وہ تعبیر چاہتا ہے۔ اسی موضوع پر ان کا افسانہ "سیڑھیاں" چھوڑی ہوئی زمینوں، تہذیب، سماج کی باز آفرینی کی کہانی لیے ہوئے ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار "سید" خواب دیکھتا ہے مگر کچھ عرصہ سے خواب آنے بھی بند ہو جاتے ہیں تو یہ محرومی ایک بنجر زندگی کی علامت بنتی ہے جس سے خوابوں کی شادابی، حسن چھین لیا گیا ہے۔ خوابوں کا چھن جانا اس کی زندگی کا بڑا المیہ ہے۔ اس افسانے میں انتظار حسین رقم طراز ہیں۔

> "سید سوچ میں پڑ گیا کیا واقعی وہ خواب نہیں ہے؟ وہ سوچنے لگا تو پھر کیا میری ساری زندگی ہی خوابوں سے خالی ہے۔ اسے کبھی کوئی خواب نہیں دکھائی دیا۔"[7]

انتظار حسین کو شدت سے احساس ہے کہ ان کی ذات کا کوئی حصہ کٹ کر ماضی میں رہ گیا ہے اور موجود معاشرے کی کوئی تصویر اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب ماضی کے کٹے ہوئے حصے کو تخیل کے راستے واپس لا کر اپنی ذات میں سمو نہ لیا جائے۔ ان

کے تخیل میں ماضی کی دنیا مثالی، کامل اور بے نظیر تھی۔ اس مثالی دنیا کی بازیابی ان کی آرزوں میں شامل تھی۔ انتظار حسین کا افسانہ ''خواب اور تقدیر'' آخری آدمی، کشتی میں بھی مثالیت کا رجحان نمایاں ہے۔ انتظار حسین خواب دیکھنے اور دکھانے والا افسانہ نگار ہے۔ وہ اپنے تصورات کے مطابق اس کائنات کی تشکیل کا خواہش مند ہے۔ یہی مثالیت کی بنیادی پہچان بھی ہے۔

جدید اردو افسانے کا آغاز

جدید اردو افسانے کا آغاز ساٹھ کی دہائی میں ہوا۔ اسی دور کا ایک اہم افسانہ نگار رشید امجد اردو کے افسانوی ادب میں منفرد پہچان رکھتا ہے۔ یہ مارشل لا کا دور تھا۔ اس دور میں اپنے حق کے لیے آواز بلند کرنا تو دور کی بات، ایک طرح سے خواب دیکھنے پر بھی پابندی تھی۔ ادیب کسی قید اور بے جا پابندی کا قائل نہیں ہوتا، وہ ظلم کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔ روشن مستقبل کے خواب دیکھتا ہے۔ جبر کے موسموں میں انسان کے حقوق کی بات کرتا ہے۔ اس قسم کے رجحانات رشید امجد کے اولین مجموعہ ''بیزار آدم کے بیٹے'' میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ''پت جھڑ میں خود کلامی'' عام آدمی اور ''دشتِ خواب'' میں بھی خوابوں، خواہشات کے خاتمے کے خواب دیکھے گئے ہیں۔ رشید امجد کا افسانہ ''سناٹا بولتا ہے'' اس کی بہترین مثال ہے۔ کچلی ہوئی عوام کی ناداری، بے کسی اور اقتدار اور طاقت کے نشے میں مست آمریت رشید امجد کے افسانوں کے بنیادی موضوعات قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ رشید امجد کے افسانوں کے کردار اتنے خوف زدہ ہیں کہ وہ اپنے جذبات کا اظہار کرنے سے بھی ڈرتے ہیں۔ اپنے خوابوں کا اظہار کرنے سے قاصر ہیں۔ مثالیت اور نئی لسانی تشکیلات کے حوالے سے رشید امجد کا افسانوی مجموعہ "ریت پر گرفت" بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان افسانوں کے اکثر کردار خوابوں کی دنیا کے باسی دکھائی دیتے ہیں۔ ڈاکٹر شفیق انجم، رشید امجد کی کردار نگاری بارے رقم طراز ہیں:

> "رشید امجد نے عام آدمی کی جو سرگزشت رقم کی ہے اس میں جبر اور گھٹن بنیادی استعارے ہیں۔ جبر کا آہنی ہاتھ فرد کو گدی سے پکڑے، دبوچے ہوئے ہے۔ ایسے عالم میں اعصاب شل اور دل و دماغ سن ہو جاتے ہیں۔ کردار بولنا چاہتا ہے اور بولتا بھی ہے لیکن خرخراہٹوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا۔ وہ سوچنا چاہتا ہے اور سوچتا بھی ہے لیکن سمجھ نہیں آتا کہ کیا سوچتا ہے۔ اپنے آپ کو چھونا اور محسوس کرنا چاہتا ہے مگر وجود نہ جانے کہاں گم ہے۔"[8]

دیگر افسانہ نگار اور اشفاق احمد

رشید امجد نے آمریت کے خوف کو موضوع بنایا اور ایک مثالیت پسند ادیب کی طرح اس خوف زدہ ماحول کے خاتمے کے خواب دیکھے۔ اپنی تصوراتی دنیا کا اظہار اپنے افسانوں میں اس طرح کیا کہ ناقدین ادب ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ جدید اردو افسانے کا ایک قد آور نام اشفاق احمد ادبی دنیا میں منفرد پہچان رکھتا ہے۔ ان کے ٹی۔ وی پروگرام، ''توتا کہانی'' اور ''زاویہ'' نے بھی ان کی شہرت و ناموری میں اہم کردار ادا کیا۔ ایک محبت سو افسانے، سفر مینا، طلسم ہوش ربا اور اجلے پھول، ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔ ان افسانوی مجموعوں میں شامل افسانوں معاشرے کا گہرا مشاہدہ اور انسانی خوابوں اور خواہشات کی کہانیاں ہیں۔ اشفاق احمد نے ترقی پسند افسانہ نگاروں سے الگ رہ کر اپنی پہچان قائم کی۔ مثالیت و حقیقت کا امتزاج ان کے افسانے ''عجیب بادشاہ'' اور ''گڈریا'' میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ''عجیب بادشاہ'' میں پروفیسر کا کردار اور ''گڈریا'' میں ''داؤجی'' اردو افسانے کے شاہکار، مثالی کردار ہیں۔ اشفاق احمد نے ان کرداروں کے پردے میں اپنی آئیڈیل فکر کا اظہار کیا ہے۔ ان کے

کردار پروفیسر "دیس راج" کو داؤ دجی کے کردار کا ابتدائی نقش قرار دیا جا سکتا ہے۔ اردو افسانے میں یہ مثالی کردار دوسرے انسانوں کے دکھ بانٹنے والے، محبتیں تقسیم کرنے والے انسانیت کے لیے آسانیاں پیدا کرنے والے اور اداس چہروں پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کرداروں کی عکاسی اشفاق احمد نے اس انداز سے کی ہے کہ یہ کردار قدیم اخلاقی قدروں کے پھیلاؤ کی خواہش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا افسانہ "بابا" اور "گڈریا" اسی انداز کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ کردار محبت کو انسانیت کا دوسرا نام قرار دیتے ہیں۔ یہ کردار محبت کا پرچار کرتے، ایک مثالی نظام حیات کی خواہش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اشفاق احمد کے افسانوں میں کرداری مثالیت کے بہترین نمونے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ داؤ جی اردو کے مثالی کرداروں میں ایک ناقابل فراموش کردار ہے۔ جس کا علم، انسان دوستی کا درس دیتا ہے۔ مذہبی تعصب سے کوسوں دور یہ کردار اشفاق احمد کی مثالیت پسند سوچ کا بہترین عکس ہے۔ داؤ دجی کا یہ کردار استاد کے روپ میں قدرت کا ایک عطیہ ہے۔ یہ سطریں اس دعویٰ کی بہترین دلیل ہیں:

> "داؤ جی مجھے ادھر ادھر گھمانے اور مختلف درختوں کے نام فارسی میں بتاتے نہر کے اسی پل پر لے گئے جہاں پہلے پہل میرا ان سے تعارف ہوا تھا۔ اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ کر انہوں نے پگڑی اتار کر گود میں ڈال لی، سر پر ہاتھ پھیرا اور مجھے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر انھوں نے آنکھیں بند کر لیں اور کہا۔ "آج سے میں تمہیں پڑھاؤں گا اور اگر جماعت میں اول نہ لا سکا تو فرسٹ ڈویژن ضرور دلوا دوں گا۔ میرے ہر ارادے میں خداوند تعالیٰ کی مدد شامل ہوتی ہے اور اس ہستی نے مجھے اپنی رحمت سے کبھی مایوس نہیں کیا۔"[9]

داؤ جی کو عالمگیر ادب کا مثالی کردار قرار دیا جا سکتا ہے۔ فردوس انور قاصی رقم طراز ہیں:

> "اشفاق احمد کا افسانہ گڈریا کامیاب کرداری خاکہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں خلوص، سچائی ضبط اور تحمل کی اعلیٰ مثال داؤ دجی کا کردار ہے۔۔ انسانیت کا پیکر وفا کا پتلا، ایک اچھا انسان۔"[10]

خالدہ حسین زرخیز تخیل کی افسانہ نگار

جدید اردو افسانے میں خالدہ حسین زرخیز تخیل کی افسانہ نگار ہیں۔ ان کے پہلے افسانوی مجموعہ "پہچان" کی تعریف جس انداز سے غلام عباس جیسے فن کار نے کی، یہ ان کی فنی عظمت کا اعتراف ہی ہے۔ قراۃ العین حیدر نے ان کے افسانے "پسواری" کا انگریزی ترجمہ کر کے ان کے فن کا اعتراف کیا۔ خالدہ حسین کا پہلا فسانہ "نغموں کی طنابیں ٹوٹ گئیں" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ پہچان، دروازہ، مصروف عورت اور "ہیں خواب میں ہنوز" وہ افسانوی مجموعے ہیں جن کے اکثر افسانوں میں مثالیت و حقیقت کا حسین امتزاج دیکھا جا سکتا ہے۔ ان افسانوں میں تصورات، آئیڈیلز اور انسانی خوابوں کی کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ خالدہ حسین نے اساطیری اسلوب بیان وجودیت اور علامتیت کو اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ان کا افسانہ "دروازہ" میں تخیلی حیات، درون ذات کے مناظر کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ وہ اپنے ان افسانوں میں مثالی اقدار و روایات کی بازیافت کی خواہش مند دکھائی دیتی ہیں۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ایک درویش ہے، جو کمال محنت سے اعلیٰ مدارج طے کرتا ہے۔ مرشد کے حکم پر گلیوں سے کوڑا کرکٹ چنتا ہے۔ لوگوں کی جوتیاں صاف کرتا، گانٹھتا ہے۔ اس مثالی کردار میں جب احساس برتری جاگنے لگتا ہے تو مرشد سمجھاتا ہے کہ صاحبِ عمل ہونا، صاحب علم ہونے سے بہتر ہے کہ اس کی وجہ سے انسان خاک چاٹنے سے بچ جاتا ہے۔

اس افسانے میں خالدہ حسین نے ایک مثالی شہر کی بھی تصویر کشی کی ہے جو علم و حکمت کا گہوارہ ہے۔ انتظار حسین نے نئی نسل کے جن افسانہ نگاروں کو بہت متاثر کیا ان میں خالدہ حسین کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ وہ بھی ماضی کے حسن کی متلاشی "خواہش مند ہیں۔ یہ رویہ ان کے افسانے "سایہ" اور "سواری" میں نمایاں ہے۔ ان کا افسانہ "یار من بیا" کی کلثوم اردو کے افسانوی ادب کا ایک مثالی اور یادگار کردار ہے۔ جو ان کے آئیڈیلز کا ہی عکس جمیل ہے۔

خالدہ حسین رقم طراز ہیں:

"یہاں کے مرد وزن، پیر وجواں، مطالعے، مناظرے کے رسیا، عورتیں بلا کی تخلیق کار علم و دانش کی جوار بھاٹا، جگہ جگہ ادبی محفلیں جمی تھیں۔ ہر شخص بڑھ چڑھ کر بول رہا تھا۔ جتنے لفظ میں نے اس دیار میں رائج دیکھے ان کے سامنے دنیا کی لغات ادھوری تھیں۔"[11]

خالدہ حسین نے اپنے تصورات سے قاری کو ان دیکھی دنیاؤں کی سیر کروائی ہے شاید اسی وجہ سے ناصر کاظمی نے ان کے افسانے "منی" کو تنہا روحوں کی کتھا کہا تھا۔ یہ افسانہ بھی ایک طرح کی تصوراتی دنیا کی کہانی ہی پیش کرتا ہے۔ مثالیت در اصل موجود پر عدم اطمینان کا زاویہ نگاہ ہے۔ یہی صورت حال خالدہ حسین کے افسانوں میں دکھائی دیتی ہے۔

جدید اردو افسانے میں ایک عظیم نام منشاء یاد کے افسانوں میں موضوعاتی تنوع ہے۔ بطور افسانہ نگار ان کی انفرادیت، معصوم کسانوں اور پنجاب کے دیہاتیوں کے خواب اور آرزویں ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعی "بند مٹھی میں جگنو" 1975ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں مارشل لا اور مشرقی پاکستان کے سانحہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جبر اور بے چینی کے اس ماحول میں ادیب عموماً انسان کے خوابوں اور اپنی تصوراتی دنیا کو پیش کرتا ہے۔ شخصی شکست وریخت، فرد کی تنہائی، انسان کے اندر اور باہر کا تصادم اس دور کی آمریت کی ہی دین ہے۔ اس ماحول میں منشاء یاد رجائیت کا پرچار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ عوامی انقلاب کے خواب دیکھتے اور آمریت کے خاتمے کی نوید سناتے ہیں۔ وہ ایک مثالیت پسند ادیب کی طرح جب خارج کو اپنے تصورات سے منفرد پاتے ہیں تو وہ اپنے خوابوں اور آرزوں کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ اپنی سوچ کے مطابق حالات کی تشکیل کے خواہش مند دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا افسانہ "پناہ" اور "خواب کا بوجھ، بوکا" اپنے دامن میں مثالیت کو سموئے ہوئے ہیں۔ ان افسانوں میں عوامی استحصال کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس خواہش کا اظہار کیا گیا ہے کہ وہ سہولیات اور آسائشات جو خاص طبقے کو حاصل ہیں۔ عوام کو بھی حاصل ہونی چاہیں۔ مراعات یافتہ استحصالی طبقے کے زوال کی خواہش کی گئی ہے۔ صبح ہونے کے خواب دیکھے گئے ہیں۔

"کیا صبح ہو گئی؟ وہ پریشان ہو جاتی ہے۔ ضرور ہو گی تم سو جاؤ، ابا جواب دیتا ہے۔ پھر کہتا ہے۔ ضرور کچھ ہوا ہے۔ کیا ہوا ہے؟ کوئی انہونی بات، پتہ نہیں کس پر کیا گزری ہے۔ پہلے بھی ایک بار ایسا ہوا تھا۔ کب ہوا تھا ابا، یہ پرانی بات ہے بیٹے۔۔۔ کتابوں میں لکھی ہے دن چڑھے گا تو خود پڑھ لینا۔ دن چڑھے گا ابا، ہاں بیٹے۔۔۔ ہر رات خواہ وہ کتنی ہی قیامت کی کیوں نہ ہو، آخر کار ختم ہو جاتی ہے اور سورج نکلتا ہے صبح طلوع ہوتی ہے۔"[12]

منشاء یاد کے افسانے

جدید اردو افسانے میں منشاء یاد کے افسانے منفرد پہچان رکھتے ہیں۔ ان کے افسانے موضوعاتی تنوع، حقیقت و مثالیت کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہیں۔ منشاء یاد چونکہ دیہی معاشرت کے نمائندہ ہیں اس لیے اس کے اکثر افسانوں میں دیہات کی

دلفریب فضا، دیہاتی لوگوں کے جذبات و احساسات خواہشات اور خوابوں کو بیان کیا گیا ہے۔ "بند مٹھی میں جگنو" کے اکثر افسانوں میں تصوراتی، تخیلی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ "شبِ چراغ" اور "خواب در خواب"، "خواب کا بوجھ" افسانوں میں انسانی آرزوں اور خوابوں کی کہانیاں ہی بیان کی گئی ہیں۔ تماشا "منشاء یاد کا ایک غیر معمولی افسانہ ہے جو ناقدینِ ادب سے داد وصول کر چکا ہے۔ پاکستانی معاشرہ اور عوام کی بے حسی کو علامتی رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔ افسانہ "کچی پکی قبریں" میں ایک کردار کوڈو فقیر کی تصوراتی دنیا کو بیان کیا گیا ہے۔ منشاء یاد لکھتے ہیں:

> "وہ قریبی پل کے نیچے سے بہتی ہوئی نہر کو دیکھتا ہے تو اسے لگتا ہے جیسے نہر کا پانی پل کے نیچے سے نہیں بہہ رہا کسی دیو قامت کوڈو کے حلق میں اترتا جا رہا ہے۔ وہ پہروں نہر کے کنارے بیٹھا حقہ پیتا او خوب صورت خیالوں سے کھیلتا رہتا ہے۔"[13]

جدید افسانے میں محمد خان کا کردار

جدید افسانے کا تذکرہ اسد محمد خان کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ ان کے پاس متنوع زندگی کے گہرے تجربات ہی نہیں، فطرت انسانی کا شعور، تخیل اور خوابوں کا وسیع ذخیرہ بھی موجود ہے۔ اردو کی افسانوی دنیا میں وہ اپنے پہلے مجموعے "کھڑکی بھر آسمان" سے داخل ہوئے۔ باسودے کی مریم، ترلوچن اور "مئی دادا" جیسے یادگار افسانے انہوں نے اردو ادب کو دیئے۔ "باسودے کی مریم کو اردو کے نعتیہ ادب میں بے مثال اضافہ قرار دیا جاتا ہے۔ افسانہ "ترلوچن" کراچی کی کچی آبادیوں کے دکھوں کو ایک مثالی خیال طرازی سے پیش کیا گیا ہے۔ اسد محمد خان تاریخ سے انسانی بصیرت تلاش کر کے انسانی فطرت کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور انسانی فطرت میں چھپی تمناؤں کا انکشاف انہیں مثالیت پسندی کے قریب لے جاتا ہے۔ اس حوالے سے تاریخ فرشتہ، ندی اور آدمی یادگار افسانے ہیں۔ پاکستانی معاشرہ کس طرح آج مثالیت کا شکار ہے اور اشرافیہ کے ساتھ نچلا طبقہ بھی اپنی آرزوں کی تکمیل کے لیے دیوانہ وار دوڑ رہا ہے۔ تہذیبی بحران اور اس کے خاتمے کی تمنا بھی ان کے افسانوں کا خاص موضوع ہے۔ موجود معاشرتی و تہذیبی انتشار کے خاتمے کی خواہش اور پر امن تہذیب و معاشرے کے قیام کی خواہش انہیں مثالیت پسند فکر کا افسانہ نگار ثابت کرتی ہے۔

جدید اردو افسانہ جن کا آغاز ساٹھ کی دہائی کے قریب ہوا۔ اس افسانے نے حقیقت و مثالیت کو دامن میں سمو لیا۔ اس دور کے افسانہ نگاروں نے اپنے ارد گرد کے مسائل کے ساتھ ایک مثالی معاشرے کے قیام کے خواب بھی دیکھے۔ ایسا مثالی معاشرہ جو موجودہ معاشرتی بے چینی اور مسائل سے پاک ہو۔ جہاں امن، مساوات، عدل و انصاف، بے تعصبی کا بول بالا ہو۔ عرض افسانہ نگاروں نے اپنے تصورات میں محفوظ دنیا کو قرطاس پر منتقل کیا اور مثبت معاشرتی تغیر کی خواہش کا اظہار کیا۔ متذکرہ بالا افسانہ نگاروں کے علاوہ جن افسانہ نگاروں نے جدید افسانے کی ترویج واشاعت میں کلیدی کردار ادا کیا ان میں رشید امجد، اسد محمد خان، نیر مسعود، مظہر الاسلام، آغا سلیم قزلباش، ذکا اللہ کے اسماء لیے جاسکتے ہیں۔ ان سبھی افسانہ نگاروں کے فن میں مثالی سوچ کا اظہار کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ انسان کی تصوراتی دنیا خواہشات، خواب، عقل پرستی کا رجحان ان افسانہ نگاروں کو مثالیت پسندی کے قریب لے جاتا ہے۔ یہی وہ رجحانات ہیں جن کے سبب اردو افسانہ آفاقیت کی سطح پر نظر آتا ہے۔

خلاصۂ بحث

اس تجزیے سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ مثالیت کے افکار براہ راست افلاطون کے افکار سے لئے گئے ہیں۔ مثالیت کی دنیا خوابوں کی دنیا ہے جہاں انسان اپنے ان خوابوں کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے مضطرب رہتا ہے۔ اردو افسانے کے آغاز سے ہی اس میں حقیقت و مثالیت کا حسین امتزاج دکھائی دیتا ہے۔ پریم چند اور یلدرم کا افسانوی ادب اس کی بہترین مثال ہے۔ جدید افسانے میں بھی مثالیت پسند سوچ کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ غلام عباس کا افسانہ "کتبہ" مثالیت پسند سوچ کا ہی عکاس ہے۔ افسانہ "اوور کوٹ" میں بھی شخصیت کے مثالی پن کا ہی اظہار ہے۔ احمد ندیم قاسمی کا افسانہ "کپاس کا پھول" میں بھی مثالی فکر کو ہی پیش کیا گیا ہے۔ جدید اردو افسانے میں اشفاق احمد کسی تعارف کے محتاج نہیں ان کا افسانہ "گڈریا" کا مثالی کردار داوجی مدتوں یاد رکھا جانے والا کردار ہے۔ مثالیت پسندی کا رجحان آج کے افسانے کو بھی اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے لیکن معاشی اور تہذیبی انتشار نے اردو افسانے کو حقیقت کے زیادہ قریب کر دیا ہے۔

References

[1] Ṣifāt Ahmad ʻAlvī, *Afsāna?* (Karachi: 2006), 110.
[2] Prof. Khursheed Ahmad, *Jadeed Urdu Afsana* (Ali-Garh: Letho Color Prints, 1977), 16.
[3] Dr. Farmān Fateḥpūrī, *Urdu Afsana Nigaar* (Karachi: Urdu Academy, 1982), 22.
[4] Ghulām ʻAbbās, *Khuda kī Bādshāhat aur Dosry Afsāny* (Multan: Becon Books, 2014), 44.
[5] Amjad Ṭufail, *Qura tul Ain Ḥaider: Tashakuṣ kī Talāsh* (Lahore: Pakistan books Literary Sounds, 1991), 15.
[6] Ahmad Nadeem Qāsmī, *Chālees Behtreen Afsāny* (Lahore, Sang-e-Meel Publications, 2003), 549.
[7] Intazār Hussain, *Shehar-e-Afsoos* (Lahore: Maktaba-e-Kārwan, 1972), 163.
[8] Dr. Shafeeq Anjum, *Rasheed Amjad aik Muṭāliʻa* (Rawalpindi: Naqash Gar Publishers, 2009), 122-123.
[9] Ashfāq Ahmad, *Gadriya* (Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2016), 18.
[10] Dr. Qāzī Firdous Anwar, Urdu Afsāna Nigārī kay Ruḥjānāt (Lahore: Maktaba ʻAliya, 1999), 80.
[11] Khālida Hussain Majmūʻa-e-Khālida Hussain (Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2008), 227.
[12] Manshā Yād, Boka (Rawalpindi: Maṭbūāt-e-Ḥurmat, 1983), 93.
[13] Manshā Yād, Mās aur Mattī (Islamabad: Modern Book Deput, 1980), 18.